تقسیم علوم دینؒ صاحب ینابیع کی نظر میں

(۲)

ابو الفتح محمد صغیر الدین ایم اے

فصل پنجم میں اس امر کا بیان ہے کہ علم تصوف کس کو کہتے ہیں۔ اس علم کے موضوع اور غرض وغایت سے بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ علم تصوف علوم دینیہ کا خلاصہ ہے۔

علم تصوف کے لغوی اور اصطلاحی معنی | تصوّف اور صوّوف بروزن قعود کے لغوی معنی ہیں تیر کا نشانہ سے ایک طرف کو جانا اور کسی شخص کا ایک طرف کو جانا اور کسی سے بدی کا ایک طرف ہونا۔

اور اصطلاح میں قلب کو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کر لے اور غیر اللہ سے اعراض اور تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھنے اور نفی خطرات کو تصوّف کہتے ہیں۔

خواجہ علی رامتینیؒ سے کسی نے پوچھا کہ طریقت کی اصل کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ خدا سے ملنا اور ماسوا سے ٹوٹنا۔ گویا تصوّف قطع علائق کا اور خالق خلائق کی طرف متوجہ ہونے کا نام ہے۔

موضوع | کسی علم کا موضوع وہ ہوتا ہے جس کے عوارض ذاتیہ سے اس علم میں بحث

کی جاتی ہو۔ مثلاً علم طب کہ اس کا موضوع جسم انسانی ہے کیونکہ اس علم میں جسم ا
کے احوال یعنی مرض اور صحت کے متعلق بحث کی جاتی ہے، اسی طرح علم تصوّف
انسان کا نفس اور قلب ہے، اس علم میں قلب و نفس کے احوالِ باطنی سے اور
امراض سے بحث کی جاتی ہے، جو امورِ اُخرویہ کے لئے مُضر ہیں اور دینی صحت
مانع ہیں۔

غرض وغایت اس علم سے غرض تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس ہے، اور
اسلوب طاعات کی کثرت اور ذکر الٰہی کی مداومت اور تم
عبادات میں اخلاق ہے اور اس علم کا فائدہ اس دنیا میں یہ ہے کہ انسان اوص
حمیدہ سے متصف ہو اور پسندیدہ اخلاق کو اختیار کرے۔ اسے حقائق ومعار
کا کشف حاصل ہو اور آخرت میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اعلیٰ ترین درجہ حاصل
مقربین ومحبّین کے زمرہ میں شامل ہو۔

اِحسان کی تعریف اور اس کے ارکان وشرائط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تشریح
ہے کہ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت
طرح کی جائے کہ گویا عبادت کرنے والا اسے
رہا ہے اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم ازکم یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے
تصوّف میں دراصل اسی کیفیت کے حاصل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے،
تصوف کا مدار ہی احسان پر ہے۔ اور احسان کے دو رکن ہیں (۱) اخلاص (۲
قلب۔

(۱) اخلاص کے پانچ رکن ہیں (۱) ترکِ سمعت (۲) ترک ریاء (۳) ترک
(۴) ترک طمع (۵) طلب رضائے خداوندی،
یعنی شہرت کی خواہش نہ ہو، ریاء سے پاک ہو، خود پسندی میں مبتلا
طمع سے خالی ہو اور محض رضائے خداوندی کی طلب ہو۔
(۲) دوسرا رکن حضور قلب ہے یعنی ہمیشہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال رہے

حضورِ قلب بعض عبادات میں تمام اجزائے عبادت میں شرط ہے، مثلاً دعا کہ حضورِ قلب کے بغیر دُعا نہ ہوگی اور جب دعا نہ ہوئی تو عبادت بھی نہ ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دُعا مغزِ عبادت ہے۔ لیکن درود شریف اس سے مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ درود شریف خواہ ریا، کے ساتھ یا بغیر حضورِ قلب کے پڑھے بہرحال اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ نماز میں نیّت کے وقت حضورِ قلب شرط ہے، اگر اس وقت قلب حاضر نہ ہو تو نماز نہ ہوگی۔ باقی تمام نمازمیں حضورِ قلب کا ہونا کمالِ نماز کے لئے تو البتہ شرط ہے لیکن اصل نماز کے لئے شرط نہیں کیونکہ اس کے بغیر بھی درست ہوجائے گی۔ روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ میں صرف نیّت کے وقت حضورِ قلب شرط ہے۔ اور قولی عبادت جو دوسروں کے نفع کے لئے ہو مثلاً تعلیم اور اذان وغیرہ، تو اس میں نیّت کے وقت حضورِ قلب کا ہونا حصولِ ثواب کے لئے کافی ہے اور تلاوتِ قرآن و دیگر اذکار میں اصل ثواب کے حصول کے لئے یہ کافی ہے کہ نیت کے وقت حضورِ قلب حاصل ہو۔

شرائطِ احسان

احسان کاملوں کا شیوہ ہے اور اس کی اہمیّت سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس امتِ مکرمہ کو اس کی تعلیم دینے کے لئے آئے۔ یہ عبادتِ کاملہ کے لئے شرط ہے اور تمام عبادات میں خواہ وہ قولی ہوں یا بدنی یا مالی ہوں، احسان کا ہونا ضروری ہے۔ توبۂ نصوح، ورع، تقوٰی، تعفف اور زہد، احسان کے شرائط میں سے ہیں۔ ان سبھوں سے مقصود یہ ہے کہ قلب سے گناہ کی تاریکیاں دُور کی جائیں۔ اور احسان کے لوازم میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا ہو اس کی محبّت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور اس سے امّید ہو۔ اور ان چیزوں سے صبر و شکر، تمکین و ثبات، قناعت و توکل، رضا بقضاء اللہ، تحمّلِ مکارہ اور اتّباعِ سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تواضع پیدا ہوتا ہے، نیز حِلم پیدا ہوتا ہے جو کہ نصیحت و شفقت، خدمت و سخاوت، الفت و مدارات، موافقت و مروّت وغیرہ کی صفات پر مشتمل ہے۔ اور احسان

کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ دل غیر اللہ سے خالی ہو جاتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے، یعنی دل کی تطہیر ہوتی ہے، جس کا آیت وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً کے ذریعے حکم دیا گیا ہے اور یہ تطہیر کشف کا سبب بنتی ہے۔

ہر کرا جان از ہوسہا گشت پاک زود بیند قصر ایوان سماک
چشم دل از شوم کورے پاک کن تا بہ بینی قصر فیض من لدن

اور اس تطہیر سے علوم عالیہ یعنی الہامات، واقعات اور مکاشفات و مشاہدات حاصل ہوتے ہیں اور نفس و شیطان کے مکائد معلوم ہوتے ہیں، ریا کی باریکیوں کا علم حاصل ہوتا ہے اور شہوات خفیہ اور منازل و مقامات اور روح و عقل کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات اور ملک و ملکوت کے اسرار غامضہ کی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم تصوف دینی علوم کا خلاصہ ہے۔

فصل ششم میں حدیث اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ کی تشریح کی گئی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ تیسرا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔

وہ حدیث یہ ہے:

العلمُ علمانِ، علمٌ فی القلبِ فذاكَ العلمُ النافعُ، وعلمٌ علی اللسانِ فذاكَ حجّةُ اللهِ عزّ وجلّ علی ابنِ آدمَ۔

یہ حدیث حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اس کو بحوالہ دارمی نقل کیا ہے۔

علم علی اللسان سے مراد وہ علم ہے جو زبان ہی پر رہے اور اس کی روشنی دل تک نہ پہنچے، یہ علم اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ (نعوذ باللہ من قول بلا عمل)

اس معنی کے لحاظ سے علم سے مراد دین اسلام کا علم ہے۔ اور علم تو ایک ہی ہے لیکن اس کی دو قسمیں اشخاص کے اعتبار سے ہیں کہ کسی کے حق میں دین اسلام کا علم مضر ہے اور اللہ تعالیٰ کا غضب ہے، اس کے حق میں جہل ہی زیادہ نافع ہوتا ہے،

یعنی علم بذاتِ خود تو محمود ہے لیکن بعض کے حق میں زہرِ ہلاہل ہے تو کسی کے حق میں آبِ حیات ہے۔ ایک کے لئے علم حشر میں دامنگیر ہوگا تو دوسرے کے حق میں شفیع بن کر آئے گا، اس بنا پر علم کی دو قسمیں ہوگئیں ورنہ اصل میں علم ایک ہی ہے۔

علم نافع یہ ہے کہ دل میں اترے اور اس کو منوّر کرے اور اعمال اس امر کے شاہد ہوتے ہیں کہ دل علم کے نور سے نورانی ہوچکا ہے اور یہی اعمال مکاشفات وحالات کا سبب بنتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس حدیث کی شرح میں ذکر کیا کہ شیخ محقق عارف باللہ احمد بن عطار اسکندری نے کتاب الحکم میں ذکر کیا کہ علم نافع وہ ہے کہ سینے میں اس کی کرن پھیلے اور قلب کے پردے ہٹ جائیں۔

اور اکثر کا خیال یہ ہے کہ حدیث مذکور میں 'دو علم' سے مراد علم ظاہر اور علم باطن ہے۔ چنانچہ مجمع البحار میں مادۂ علم میں اس احتمال کو ذکر کیا کہ 'دو علم' سے مراد علم ظاہر اور علم باطن ہے۔ علم ظاہر اوامر و نواہی اور آداب و تکالیفِ شرعیہ کا علم ہے، جس کی تبلیغ تمام مکلفین کے لئے مساوی ہے۔ اور اس کا حکم سب پر یکساں جاری ہے اور یہ مکلفین پر حجت ہے کیونکہ بواسطہ یا بلاواسطہ رسالت کی تبلیغ کے بعد ان لوگوں کے لئے کوئی حجت اور عذر باقی نہیں رہتا ہے۔ اور علم باطن علم طریقت ہے، اس کو علم القلوب اور علم الحقیقۃ بھی کہتے ہیں۔

بعضوں کے نزدیک اس 'دو علم' سے مراد علم دراست اور علم درایت ہے، لیکن علامہ داہریؒ کے نزدیک فہم اور حق وصواب کے زیادہ قریب وہ توجیہ ہے جو شیخ عبدالحقؒ نے شرح مشکوٰۃ میں بیان کی ہے کہ علمِ نافع جو دل سے تعلق رکھتا ہے، وہ عمل کا باعث ہوتا ہے اور مقرون بالعمل ہوتا ہے اور علمِ مکاشفہ علم کے مطابق کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے علم نافع کی دو قسمیں ہیں، ایک علم دراست جو مقرون بالعمل ہو، دوسرے علم درایت جو کہ کشفی علم ہے۔ اور وہ علم دراست جس کے ساتھ عمل نہ ہو، وہ بندے پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور وبال ہے۔

بعض صحابہؓ کا بعض علوم کے ساتھ مخصوص ہونا،

صحابہؓ کی ایک جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص علم سکھا کر، شرف امتیاز بخشا تھا، چنانچہ مکتوباتِ منیریہ کے بائیسویں مکتوب میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہؓ میں سے ایک گروہ کو طریقِ حق پر چلنے کے لئے منتخب فرمالیا تھا اور خلوت میں جس وقت آپؐ ان حضرات سے گفتگو میں مشغول ہوتے تو اس وقت رؤسائے عرب اور عام صحابہؓ کو وہاں رسائی نہیں ملتی تھی۔ ان حضرات کی تعداد ستّرؓ کے قریب تھی، اور ان میں بعض تو منتہی تھے، مثلاً خلفائے اربعہؓ اور حضرت سلمانؓ وغیرہم اور بعض متوسط تھے مثلاً حضرت معاذ، بلال، ابوذر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

متعدد روایات واحادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بعض صحابہؓ بعض علوم کے ساتھ مخصوص تھے۔ چنانچہ علامہ داہریؒ نے اس کے ثبوت میں متعدد روایات پیش کی ہیں۔ منجملہ ان کے مشکوٰۃ کی وہ روایت بھی بیان کی ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

حفظتُ من رسولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم وِعآئینِ ای من العلمِ فاما احدُھما فبثثتُہٗ فیکم ، واما الآخر فلو بثثتُ لقطع ھٰذا البلعُوم یعنی مجری الطعام (رواہُ البخاری)

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ظرف (علم کے) یاد کرلیے ہیں، چنانچہ ان میں سے ایک کو تو میں نے ظاہر کردیا اور دوسرے کو اگر ظاہر کروں تو یہ بلعوم کاٹ ڈالی جائے۔ بلعوم سے مراد حلق ہے۔

ایک علم کا آپؐ کے ساتھ مخصوص ہونا

قوت القلوب میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم کو تین حصّوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک قسم تو وہ ہے جو عام وخاص سبھوں کو پہنچا دیا۔ یہ حدود شرعیہ اور اوامر ونواہی اور توحید ومعاد کے مسائل کا علم ہے۔ اور دوسرا حصّہ ایک مخصوص جماعت

کو سکھایا لیکن دوسروں سے اس کو مخفی رکھا۔ یہ اسرار وحقائق کا علم ہے۔ اور تیسرا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا، جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:

"لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیرًا"

یعنی اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ"

لیکن جو علم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا، اس میں ما و شما کے قیل وقال یا گفت وشنید کی گنجائش نہیں ہے۔

علم تصوف کا انبیا و اولیا سے توارث کے طور پر جاری وساری ہونا

فصل ہفتم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ علم تصوف کی دولت بنی آدم کے سلسلے میں انبیا و اولیا سے توارث کے طور پر جاری وساری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کی تخلیق سے پیشتر بہت سے عالم پیدا کئے تھے، جن میں بعض تو قہر وجلال کے مظہر تھے مثلاً شیاطین۔ اور بعض لطف وجمال کے مظہر تھے مثلاً ملائکہ۔ لیکن ایسی مخلوق نہ تھی جو جلال وجمال دونوں کی مظہر ہو اور علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ یہ استعداد آدم علیہ السلام ہی میں ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر عشق الٰہی کا خزانہ ان کے سینے میں رکھا، کیونکہ اس کا ایک ذرہ دوعالم سے بہتر ہے اسی طرح تمام انبیا علیہم السلام کے سینوں میں اس کے خزانے رکھے اور ان کی پیروی کی وجہ سے اولیائے کرام کو بھی ان کی استعداد کے مطابق حصہ ملتا رہا۔

کیا فرشتوں کو عشق الٰہی ہے؟

فرشتوں کو حق تعالیٰ کا عشق نہیں ہے بلکہ وہ محبت اور معرفت الٰہی رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ عشق اس سوز واضطراب کا نام ہے جو معشوق کی جدائی کی وجہ سے عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کو سکون حاصل نہیں ہوتا ہے جب تک کہ وصل نہ ہو۔ اور یہ عشق علم کے بغیر ممکن نہیں اس لئے کہ کوئی شخص کسی چیز کی حقیقت سے واقف ہوکر ہی اس کے وصل کے لئے

مضطرب اور شیفتہ ہوتا ہے، اس واقفیت کا نام علم ہے اور اضطراب و شیفتگی عشق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم عشق کا مبادی اور اس کا دیباچہ و دلیل ہے اور عشق علم کے بغیر ممکن نہیں۔

فرشتے جو عشق نہیں رکھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق تحصیل غیر حاصل کے لئے اور قوت سے فعل کی طرف لانے کے لئے ہوتا ہے اور فرشتوں کے ساتھ صورت یہ ہے کہ انہیں بارگاہِ حق میں جو رتبہ حاصل ہے وہ بالفعل ابتدا سے حاصل ہے۔ جنابِ باری تعالیٰ میں ہر ایک کو مخصوص مرتبہ اور مقام حاصل ہے، ان کے درجات معین ہیں کہ ان سے تجاوز اور ترقی نہ تو ممکن ہے اور نہ ان میں سے کسی کو تجاوز کی خواہش ہے۔ بلکہ ابتدائے تخلیق ہی سے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے موجودہ درجات و حالات پر راضی ہیں اس لئے کہ ان کے حق میں کسی قسم کے سوز و اضطراب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہاں، فرشتے محبت اور معرفتِ الٰہی رکھتے ہیں، کیونکہ محبت دل کے میلان اور مرضی کو کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ فرشتے شب و روز اس کی عبادت میں مشغول ہیں۔ اگر محبت نہ ہوتی تو مکروہ سمجھتے اس لئے کہ محبت کراہت کی ضد ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کو مکروہ نہیں سمجھتے تو یقیناً اس کو دوست رکھتے ہیں۔ اور معرفت بھی رکھتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی ذات و صفات کو بھی پہچانتے ہیں، گویا فرشتوں کی اللہ تعالیٰ سے محبت لغوی معنیٰ کے لحاظ سے ہے، اصطلاحی معنیٰ کے لحاظ سے نہیں۔ اس لئے کہ اصطلاح میں محبت الٰہی عشق کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھول جانا ہی حجاب ہے

بندے اور پروردگار کے درمیان کوئی چیز حاجب حاجب نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تو حجابات سے منزہ ہے اور وہ بندوں سے ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ صرف حق کو بھول جانا ہی حجاب ہے، چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت و کرامت سے بھول جاتا ہے اور تدبیرات اخرویہ کو اس شخص سے فراموش کر دیتا ہے اس لئے نسیان کے سوا کوئی حجاب نہیں، اور جس قدر یہ حجاب سخت تر ہوگا بندہ حق سے

اتنا ہی دور ہوگا یہ حجاب اس کی ضد سے زائل ہوگا اور ضد اس کی یاد ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فَاذْكُرُوْنِىْ اَذْكُرْكُمْ" "تم مجھے یاد کرو تو میں تم کو یاد کروں گا"

اور اس ذکر و نسیان کا تعلق دل سے ہے، جس وقت دل غیر کے ساتھ مشغول ہوگا تو اس وقت وہ حق سے محجوب اور دور ہوگا۔ اور بندہ جس قدر حق تعالیٰ سے غافل ہوگا اسی قدر اس سے دور ہوگا۔ گویا دوری اور فراموشی بندے کی طرف سے ہے، حق تعالیٰ اس سے منزّہ ہیں۔ دوری مکان سے تعلق رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ مکان سے اور نسیان سے منزّہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون سے یکساں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا قرب ذکر سے ہے اور فرعون کا بُعد نسیان سے ہے۔ اس لئے انسان کی انسانیت ذکر کی وجہ سے ہے، صورت کی وجہ سے نہیں ہے۔

فصل ہشتم میں علامہ داہری نے سلسلۂ سَنیّہ نقشبندیہ مجددیہ کو بیان کرتے ہوئے وہ شجرہ نقل کر دیا ہے جو ان کو ان کے مرشدؒ کی طرف سے خلافت کے سلسلہ میں عطا ہوا تھا۔ اس کی عبارت درج ذیل ہے۔[ع۵]

الحمدُ للهِ علىٰ كلِّ حال ٭ والصلوٰةُ والسلامُ علىٰ رسولهٖ محمّدٍ صاحبِ الكمال ٭ وعلىٰ آلهٖ واصحابهٖ اربابِ النوال ٭ اَمّا بعدُ فيقولُ العبدُ الراجى الىَ اللهِ تعالىٰ الفقيرُ عبدُ الرسول[۱] الصديقى الاحمدآبادى قد البستُ الخرقةَ الفقيريّةَ الاخَ فى الدّين ابا الحسَن السندى[۲]

ع۵ چونکہ حضرت سلطان العارفین بایزیدؒ نے حضرت امام جعفر صادقؓ کی روحانیت سے فیض حاصل کیا پھر حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کو حضرت بایزید بسطامیؒ سے بطریقِ اویسیت فیض پہنچا، بعد ازاں شیخ ابوعلی فارمدیؒ، حضرت ابوالحسن خرقانی سے بطریقِ اویسیت مستفیض تھے، اس لئے اس سلسلہ کو سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ بھی کہتے ہیں۔

۱ متوفی ۱۱۳۶ھ ۲ متوفی ۱۱۸۶ھ۔

جعله الله من الصالحين الصادقين المخلصين ۔ وانا لبستها من يد الشاه فتح الله قدس سرہٗ ۔ وهو لبسها من يد محمد المعصوم ۔ وهو لبسها من يد مجدد الالف الثانی الشيخ احمد السرهندی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ محمد الباقی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ الامكنگی وهو لبسها من يد الشيخ درويش ولی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ الزاهد وهو لبسها من يد الشيخ عبيد الله الاحرار ۔ وهو لبسها من يد الشيخ يعقوب الجرخی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ الرحمانی والقطب الربانی بهاء الحق والشرع والدين محمد النقشبند البخاری ۔ وهو لبسها من يد الشيخ الامير الكلال ۔ وهو لبسها من يد الشيخ محمد السماسی ۔ وهو لبسها من علی الراميتنی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ محمود انجير فغنوی وهو لبسها من يد الشيخ العارف ريوكری ۔ وهو لبسها من يد الشيخ عبد الخالق الغجدوانی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ ابی يوسف الهمدانی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ ابی علی الفارمدی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ ابی الحسن الخرقانی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ سلطان العارفين ۔ وهو لبسها من يد الامام جعفر الصادق ۔ وهو لبسها من يد الشيخ القاسم ۔ وهو لبسها من يد الشيخ سلمان الفارسی ۔ وهو لبسها من يد الشيخ خليفة رسول الله صلی الله

---

۱ متوفی ۱۰۷۹ھ ۲ متوفی ۱۰۳۴ھ ۳ متوفی ۱۰۱۲ھ ۴ متوفی ۱۰۰۸ھ ۵ متوفی ۹۷۰ھ
۶ متوفی ۹۳۶ھ ۷ متوفی ۸۹۵ھ ۸ متوفی ۸۵۱ھ ۹ متوفی ۷۹۱ھ ۱۰ متوفی ۷۷۲ھ
۱۱ متوفی ۷۵۵ھ ۱۲ متوفی ۷۱۵ھ ۱۳ متوفی ۷۱۵ھ ۱۴ متوفی ۶۱۶ھ ۱۵ متوفی ۵۷۵ھ
۱۶ متوفی ۵۳۵ھ ۱۷ متوفی ۵۱۱ھ ۱۸ متوفی ۴۲۵ھ ۱۹ متوفی ۲۶۱ھ ۲۰ متوفی ۱۴۸ھ
۲۱ باختلاف روایت ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ یا ۱۰۱ھ ۔
۲۲ متوفی ۳۳ھ ۔

علیہ وعلی آلہ وسلم ابی بکر الصدیق۔ وھو لبسھا من ید خاتم النبیین وسید المرسلین وشفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ و صحبہ وسلم۔

فصل نہم میں شریعت، طریقت اور حقیقت کا بیان ہے اور ان کے درمیان فرق کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

شریعت اور طریقت کا فرق

لغت کے اعتبار سے شریعت اور طریقت دونوں مترادف ہیں، سبیل یعنی راہ کے معنیٰ میں ہیں اور روش اور نہج کے معنی میں بھی آتے ہیں۔

اور سالکین کی اصطلاح میں شریعت ظواہر افعال و اقوالِ اسلامی کو کہتے ہیں اور طریقت ان کے بواطن کو کہتے ہیں۔ شریعت کا تعلق جوارح کے ساتھ ہے اور طریقت کا دل کے ساتھ۔ مثلاً نماز کے افعال میں قیام، رکوع، سجود یا اقوال میں قراءت، تسبیح وتشہد وغیرہ شریعت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نیت اور استحضار طریقت ہے۔ زبان سے اقرار شریعت ہے اور دل سے تصدیق طریقت ہے۔ تمام بدنی ومالی عبادت شریعت ہے، اخلاصِ نیت طریقت ہے۔ ہر فعلی، قولی، مالی اور جانی عبادت بحیثیت ظاہر کے شریعت ہے اور بحیثیت باطن کے طریقت ہے۔ اور ہر وہ عبادت کہ خلق اس سے مطلع ہو جائے خواہ آنکھ کے ذریعے خواہ کان کے ذریعے مطلع ہو یہ شریعت ہے اور ہر وہ عبادت جو بندے اور حق تعالیٰ کے درمیان ہو اور کسی مخلوق کو اس پر اطلاع نہ ہو خواہ وہ عبادت قلبی ہو یا غیر قلبی تو یہ طریقت ہے۔

مختصر یہ کہ شریعت تمام افعال واقوال ظاہریہ کا نام ہے اور طریقت ان افعال و اقوال واعمال کی روح ہے۔ لیکن طریقت وشریعت کا یہ فرق محض عقلی اور اعتباری ہے یعنی اعتبار اور تعقل میں ایک دوسرے سے جدا ہیں ورنہ حقیقت میں جدا نہیں ہیں شریعت بغیر طریقت کے اور طریقت بغیر شریعت کے کبھی وجود نہیں رکھتے ہیں۔ شریعت بغیر طریقت کے نفاق ہے اور طریقت بغیر شریعت کے زندقہ اور ضلالت ہے۔

شریعت اور طریقت کی مذکورہ بالا تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ طریقت اجزا
شریعت میں سے ایک جزء اور اس کی رُوح ہے۔ جس طرح انسان کی رُوح انسا
کے اجزاء میں سے ہے، اسی طرح ایمان روحِ اسلام ہے۔

لیکن علمائے شریعت دونوں کو ایک ہی کہتے ہیں، اس لئے کہ طریقت شر
کی راہوں میں سے ایک راہ ہے جس کو صراطِ مستقیم اور سبیل اللہ کہتے ہیں اور با
راہیں مخفی ہیں کہ ہر راہ پر شیطان کھڑا ہے اس لئے طریقت شریعت کے اندر ہے
اس سے باہر نہیں۔ اور مشائخ طریقت ان دونوں میں فرق کرتے ہیں، جیسا کہ ا
بیان ہوا۔

ایمان اور احتساب کے معنیٰ

اذکار و عبادات کا اظہار شریعت ہے اور
واحتساباً تمام اعمال کا کرنا طریقت ہے۔ ای
عمل کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس پر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس عبادت پر اخروی
کا وعدہ فرمایا ہے اس وعدہ کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہ
کرتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے جس وعدہ کی خبر دی ہے وہ بھی
وعدہ حق ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

احتساباً کے معنیٰ یہ ہیں کہ طاعت کا اجر اللہ تعالیٰ سے طلب کرے اور غیر اللہ
سے آنکھ بالکل بند کرلے اور تمام طاعت حسبۃً للہ کرے۔

لغت میں احتساب کے دو معنیٰ ہیں ایک تو اللہ تعالیٰ سے خوف و عجز کے سا
ثواب کی اُمید رکھنا، احادیث میں جہاں جہاں احتساباً کا لفظ آتا ہے، اس کے یہی
ہیں۔ دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ منکرات سے منع کرنا۔ اسی لئے حاکم شریعت کو محتسب
کہتے ہیں۔

عبادت میں ایمان و احتساب اخلاص کو مستلزم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ثواب
کی امید رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتقاد رکھنا بغیر اخلاص کے ممکن نہیں ہے ا

یہ تینوں چیزیں یعنی ایمان، احتساب اور اخلاص، احسان کے اس اصطلاحی مفہوم میں داخل ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ

"اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ——

اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے"۔

حقیقت علامہ داہریؒ نے حقیقت کے لغوی معنیٰ بیان کرتے ہوئے، اہل اصول اور اہل منطق کی اصطلاح کے مطابق اس کی تعریف وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ پھر حقیقت اور ماہیت کا فرق واضح کیا ہے پھر فرماتے ہیں کہ

"ہر جا کہ در کتبِ سلوک لفظِ حقیقت علی الاطلاق ورود یابد، مراد آنجا صفتی باشد از صفاتِ حق، و ہر جا کہ حق گویند مراد ازان اللہ تعالیٰ خواہند"۔

یعنی سلوک کی کتابوں میں جہاں مطلقاً لفظِ حقیقت استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد صفات حق میں سے کوئی صفت ہوتی ہے اور جہاں حق بولتے ہیں، اس سے مراد اللہ تعالیٰ لیتے ہیں"۔

گویا سالکوں کی اصطلاح میں ذات حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو حق کہتے ہیں اور صفاتِ حق میں سے ہر صفت کو حقیقت کہتے ہیں۔ اور صفات حق میں سے ہر صفت کی حقیقت حسبِ مقدور ادراک میں آتی ہے اگر وہ ادراک واقعہ کے مطابق ہو، خواہ علم کے ذریعے ادراک ہو یا حال کے ذریعے ہو تو اس کو معرفتِ رسمی اور معرفتِ حالی کہتے ہیں۔

شیخ ابوطالب مکیؒ نے قوت القلوب میں فرمایا کہ حق لغت میں ثابت کے معنیٰ میں ہے جو باطل کے مقابلے میں بولا جاتا ہے، اور باطل وہ ہے جو ثابت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے لفظِ حق کا استعمال حقیقۃً ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ماسوا کے لئے مجازاً ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ ہے وہ سب کا سب معرض زوال میں ہے اور مستعد ہلاک ہے اور جو چیز زائل ہونے والی ہو، وہ باطل یعنی

غیر ثابت ہوتی ہے اور حق حقیقۃً واجب الوجود ہی ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" اصدق کلمۃ قالھا الشاعرُ، کلمۃُ لبیدٍ ، اَلَاکُلُّ شیئٍ مَاخَلَا اللہِ بَاطِلٌ * (اخرجہُ البخاری ومسلم)

اور حق کی حقیقت صفاتِ حق ہیں ، کیونکہ ذاتِ حق ، من حیث ذات کے صفات سے مجرّد اور اعتبارات سے خالی ہوکر عقول و اوہام کی رسائی سے باہر ہے ۔ اس لئے ذاتِ حق کی حقیقت کی معرفت جو عارف کو حاصل ہوتی ہے وہ حق کی صفات ہی کے اعتبار سے ہے ، یعنی ان صفات ہی کی معرفت حاصل ہوتی ہے ، جو کہ ذات سے متعلق ہیں ۔

مصنفؒ نے اس سلسلہ میں اپنی رائے یہ پیش کی ہے کہ

" بہتر آنست کہ گفتہ شود کہ حقیقتِ ذات مدرک و معروف نمی گردد اصلا ، و معرفتِ حقیقتِ ہر صفت من وجہٍ معرفت حقیقت ذات من وجہ است ، پس نفی معرفت بالکنہ و نفی ادراک بالکنہ از ذات و از صفات لازم می آید ، نہ نفی معرفت و ادراک من وجہ ۔ و معرفت صفات من وجہ ہمیں معرفت ذات من وجہ باشد "

یعنی ذات کی حقیقت کبھی بھی مدرک اور معروف نہیں ہوتی ہے اور من وجہ ہر صفت کی حقیقت کی معرفت من وجہ حقیقت ذات کی معرفت ہے ، اس لئے ذات و صفات کے ادراک و معرفت بالکنہ کی نفی لازم آتی ہے ، من وجہ صفات کے ادراک و معرفت کی نفی لازم نہیں آتی ہے ، اور من وجہ صفات کی معرفت من وجہ ذات ہی کی معرفت ہے ۔